سیکھنے کا فن

جے کرشنا مورتی

مترجم

ڈاکٹر یعقوب یاور

کرشنا مورتی پرگیہ پریشد

کرشنا مورتی فاونڈیشن انڈیا۔وارانسی

Seekhne Ka Fun - J. Krishnamurti

Urdu Translation of *On Learning*
Translated by Yaqoob Yawar

Authorised by Krishnamurti Foundation India

Price: *Rs.* 10.00

© 2000 Krishnamurti Foundation India
Vasanta Vihar, 64-65, Greenways Road, Chennai 600 028
Email: kfihq@md2.vsnl.net.in

Published by
J. Krishnamurti Prajyna Parishad
Krishnamurti Foundation India, Rajghat Fort, Varanasi 221 001
Email: kcentrevns@satyam.net.in

Printed by
Zarnigar,
Malti Bagh, Madanpura, Varanasi.

عرض مترجم

یہ مختصر کتابچہ بیسویں صدی کے عظیم مفکر و فلسفی جے کرشن مورتی کے ان خیالات کا ترجمان ہے جو انہوں نے سیکھنے کے عمل اور اکتساب علم کے تعلق سے ظاہر کئے تھے۔ کرشن مورتی کی نظر میں موجودہ دنیا اور یہاں رائج نظام تمدن پسندیدہ نہیں ہے۔ وہ ایسی ناپسندیدہ دنیا تعمیر کرنے والی نسل کو آنے والی نسل کی تربیت کا حق نہیں دیتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل کی پرورش اس انداز سے ہو کہ اس کا جوہر اور اس کی صلاحیت پوری طرح ابھر سکے تاکہ وہ نئی دنیا کی تعمیر میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لائق بنے۔ اس کتابچے میں انہوں نے نہایت تفصیل سے بچوں میں ذہانت وذکاوت کی تخم ریزی اور ان کی ہمہ جہت نشو و نما کے طریقوں سے بحث کی ہے۔ کرشن مورتی کے تعلیمی نظریات کی پیروی میں ہندوستان میں اور بیرون ہند کئی تعلیمی ادارے کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اور اپنے حوصلہ افزا نتائج کے باعث وہ دوسروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ نظریے ان تمام لوگوں تک

پہنچیں جو تعلیم و تعلم سے وابستہ ہیں یا جو بچوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ تاکہ وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔

جے کرشن مورتی کسی ہندوستانی زبان سے واقف نہیں تھے۔ ان کا تمام تر فکری سرمایہ انگریزی میں ہے۔ وارانسی میں سرگرم کار "کرشن مورتی فاونڈیشن انڈیا" نے جب ان کے خیالات کی ترویج واشاعت کے لئے انہیں ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا تو اردو ترجمے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ میری کوشش کا اولین نقش آپ کے سامنے ہے۔ اس مختصر کتابچے نے اگر اردو داں طبقے کو اس عظیم مفکر کی طرف متوجہ کیا تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔

وارانسی

۲؍ستمبر ۱۹۹۵ء

یعقوب یاور

شعبۂ اردو، وسنت کالج برائے خواتین

راج گھاٹ فورٹ، وارانسی۔۱

سیکھنے کا فن

میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ آج ہماری دنیا میں مسائل کے دباؤ میں آکر زندگی کے تمام مراحل کو بخوبی سمجھنے کے بعد پیدا ہونے والی یکسر مختلف قسم کی اخلاقی قدریں، برتاؤ اور عمل اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔ ہم ان مسائل کو نظم، معاشی تنظیم جدید اور اصلاحات کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی طریقہ انسانیت کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کچھ عارضی نتیجے برآمد ہوں لیکن اصلاحات، خواہ کتنی ہی وسیع اور مستحکم نظر آئیں، اپنے اندر مزید اصلاح کی گنجائش رکھتی ہیں۔ جب تک ہم حیات انسانی کی پیچیدگیوں کو پوری طرح سمجھ نہ لیں گے اصلاح کی یہ گنجائش نکلتی رہے گی۔ اصلاحات کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی اور اس کے توسط سے کسی بنیادی حل کی تلاش ہمیشہ تشنہ ثابت ہوتی رہے گی۔

ان مسائل کا حل سیاسی، معاشی یا سماجی انقلابات کے پاس بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان انقلابات کے نتیجے میں یا تو کوئی جابر اور ظالم حکومت وجود میں آتی ہے یا اقتدار کسی دوسری جماعت کو منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسے انقلاب کبھی بھی ہمارے مسائل اور زندگی کے بحران کو ختم نہیں کر سکتے۔

لیکن ایک ایسا انقلاب بھی ہے جو ان سے بالکل مختلف ہے اور اگر ہم فکر و تردد، بحران اور ذہنی انتشار کے لامتناہی سلسلہ اسیری سے باہر آنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسی انقلاب کی ضرورت ہوگی۔ یہ انقلاب اصولوں اور خیالوں کی سطح پر نہیں آئے گا کہ اس کی بے مقصدیت ثابت ہو چکی ہے، بلکہ ذہن میں بنیادی تبدیلیوں کے بعد آئے گا۔ یہ انقلاب صرف صحیح علم اور انسانی وجود کی ہمہ جہت نشو و نما سے ہی ممکن ہے۔ یہ انقلاب خیالات پر نہیں ذہن پر اپنا اختیار جمائے گا۔ اس لئے کہ خیال سبب نہیں ایک نتیجہ ہے اور تبدیلی نتائج میں نہیں اسباب کی بنیادوں میں آنا چاہئے۔ آج ہم نتائج و علائم کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور وہ عظیم ذہنی انقلاب ہمارے لئے ممکن نہیں ہو پا رہا ہے جو ذہن کو روایات و رسوم سے آزادی دلا سکے۔ ہمارا مقصود یہی عظیم انقلاب ہے جو صرف صحیح تعلیم کے ذریعہ ممکن ہے۔

ذہن کا کام ہی تلاش و تجسس اور کچھ سیکھنا ہے۔ سیکھنے سے میری مراد محض یادداشت کی تقویت اور معلومات کے مجموعے سے نہیں ہے۔ میری مراد تذبذب اور کشمکش سے عاری فکر کی صلاحیت پیدا کرنے سے ہے، جس کی ابتدا حقائق کی بنیاد پر ہو، عقائد اور مثالیت کی بنیاد پر نہیں۔ وہاں سیکھنے کا عمل یا حصول علم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جہاں ابتدا نتائج سے کی جائے۔ محض اطلاع یا معلومات حاصل کرنا سیکھنا نہیں ہے۔ سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ سمجھنے سے دلچسپی

ہو اور کسی کام کو محض اسی کام کی تکمیل کے لئے کرنے کی طلب ہو۔ سیکھنا وہیں ممکن ہو سکتا ہے جہاں کسی طرح کی زور زبردستی یا جبر نہ ہو۔ اور جبر کئی شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ کبھی اس کی شکل محبت و شفقت کی ہوتی ہے کبھی انعامات و ترغیبات کی۔ کبھی یہ حوصلہ افزائی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو کبھی دھمکی کی شکل میں۔ یہ خواہ کوئی شکل اختیار کرے جبر بہر حال جبر ہے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تقابل اور موازنہ حصول علم کے جذبے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ خیال حقیقت کے برعکس ہے۔ موازنہ انتشار اور حسد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسے ہی ہم مقابلہ کہتے ہیں۔ ترغیب کی مختلف شکلوں کی طرح ہی موازنہ یا تقابل سیکھنے کی صلاحیت کو محدود کر کے خوف کی تخم ریزی کرتا ہے۔ تحریص اور اولوالعزمی کا کردار بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ہمیشہ غیر سماجی اور تمدن کے خلاف ہوتی ہے۔ مبینہ شریفانہ اولوالعزمی بھی اپنے تعلق کے اعتبار سے ہمیشہ تخریبی ہی ہوتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ بہتر ذہنی نشو و نما کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ایسا ذہن جو زندگی کے مختلف مسائل کو اس کی مجموعی شکل میں دیکھ سکے اور ان سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے کہ اس کا نتیجہ مایوسی، انتشار، تلخی یا نکتہ چینی کی شکل میں ظاہر ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ذہن خود اپنی روایات، اپنی عاید کردہ شرائط، اپنے طے شدہ مقاصد اور اپنے تقلیدی رویے کے اثرات کے تعلق سے

بیدار رہے۔

چونکہ ہمارا خاص مقصد ایک اچھے ذہن کی نشوونما ہے، اس لئے اس بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ ایک معلم کس طرح تعلیم دے۔ تعلیم محض اطلاعات کی فراہمی کا کام نہیں ہے بلکہ ذہن کی مجموعیت کا ادراک پیدا کرنا ہے۔ معلومات فراہم کرنے کے عمل کے دوران معلم کو چاہئے کہ وہ گفتگو کے مختلف طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے طلبا میں آزادانہ سوچنے اور سوالات کرنے کی عادت کی حوصلہ افزائی کرے۔ حصول علم میں سب کچھ جاننے والے کا تصور فرضی ہے۔ معلم اور طالب علم دونوں ایک دوسرے کے درمیان استوار خصوصی رشتے کے تعلق سے سیکھتے اور علم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ معلم خیالات کو مربوط و منظم کرنے میں لاپرواہی برتے۔ خیالات کا نظم معلومات کے، منضبط قطعی اظہار کے ذریعہ ممکن نہیں ہے بلکہ جب معلم اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ احساس آزادی کے ساتھ فہم وذکاوت کی تخم ریزی ضروری ہے تو یہ فطری طور پر عمل میں آجاتا ہے۔ اس آزادی کا یہ مفہوم قطعی نہیں کہ جو آپ کے جی میں آئے کر گزریں یا آپ بے سبب سوالات کرنے کو اپنا وطیرہ اور منفی انداز فکر کو اپنی عادت بنالیں۔ اس آزادی سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اس کے اپنے مقاصد اور معیارات کے زاویے سے بیدار ہونے میں معاونت کی جائے، جو اس پر روز مرہ کی فکر اور عمل کے نتیجے میں

منکشف ہوتے ہیں۔

ایک مشروط، منضبط اور مطیع ذہن کبھی آزاد ذہن نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ذہن آزاد کہا جاسکتا ہے جہاں خواہشات کو دبادیا گیا ہو۔ آزاد ذہن تو صرف وہی ہے جو خواہشات کے تمام مراحل کو بخوبی سمجھتا ہو۔ نظم وضبط ذہن کو ایک مخصوص عقیدے یا نظام فکر کی حدود میں ہی متحرک رہنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کیا میری یہ بات درست نہیں ہے؟ ایسا ذہن فہیم وذکی ہونے کے لئے بالکل آزاد نہیں ہے۔ ایسا نظم وضبط اقتدار کے سامنے سرنگوں ہونا سکھاتا ہے یا معاشرے کے طے شدہ اصولوں کے تحت کام کرنے کی صلاحیت بیدار کرتا ہے۔ یہاں صرف صلاحیت مطلوب ہے ذکاوت نہیں۔ اسے وہ ذہن درکار نہیں ہے جو خود اپنی صلاحیتوں سے متصف ہو۔ جس ذہن نے محض یادداشت کو بروے کار لاکر صلاحیتوں کا ذخیرہ کیا ہے، وہ کمپیوٹر سے مختلف نہیں ہے۔ کمپیوٹر جو اپنے کام کی حیرت انگیز صلاحیت اور یقینی نتائج رکھتا ہے۔ مستند مانے جانے والے کی تقلید محض مخصوص سمتوں کی جانب سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور جب فکر کسی مخصوص اور متعینہ سمت میں ہو تو وہ فکر ہے ہی نہیں۔ یہ تو کسی انسانی مشین کی طرح کام کرنا ہے جو انتشار، مایوسی اور غم و آلام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ہم ہر انسانی وجود کو اس کی مکمل اور بلند ترین صلاحیت کا ادراک کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کی پوری نشوونما ہوسکے۔ ہماری مراد محض اس غیر حقیقی

صلاحیت سے ہیں ہے جو معلم نے ایک خیال یا مثال کی حیثیت سے سمجھ رکھی ہے۔ چاہے وہ مالی ہو یا سائنس داں، کسی بھی قسم کے تقابل یا موازنہ کا جذبہ فرد کی مکمل نشوونما میں رکاوٹ کھڑی کرتا ہے۔ جب تقابل درمیان میں نہ ہو تو مالی اور سائنس داں دونوں کی مکمل صلاحیت یکساں ہو جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی تقابل درمیان میں آتا ہے، تحقیر کا جذبہ اور حاسدانہ رد عمل سر ابھارنے لگتا ہے۔ جس سے انسان اور انسان کے درمیان ٹکراؤ ہونے لگتا ہے۔ غم کی طرح محبت کا موازنہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اس میں کم و بیش نہیں ہے۔ محبت محبت ہے بالکل ویسے ہی جیسے غم غم ہے۔ چاہے اس کا حامل غریب ہو یا دولت مند۔

فرد کی ہمہ جہت نشوونما سے ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جہاں مساوات ہو۔ آج معاشرے میں معاشی اور روحانی مساوات لانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، بے معنی ہیں۔ مساوات کے لئے کی جانے والی سماجی اصلاحات کی کوششوں سے ایک علاحدہ قسم کی غیر سماجی سرگرمیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ صحیح زاویے سے تعلیم دی جائے تو سماجی اصلاحات کی کوششوں سے مساوات لانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ جب تقابل یا موازنہ نہیں ہوگا تو حسد کا جذبہ بھی بیدار نہیں ہو سکے گا۔

ہمیں عمل اور سماجی حیثیت کے درمیان فرق کرنا ہوگا۔ سماجی حیثیت کا تعین اپنی تمام جذباتیت اور درجہ بند احترامات کے ساتھ اسی وقت وجود میں آتا

ہے جب اعمال کے تقابل کے ذریعہ بلند و پست کا تعین ہوتا ہے جب ہر فرد کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے تو اعمال کا تقابل نہیں ہوتا۔ پھر چاہے ایک استاد ہو یا وزیر اعظم یا پھر مالی۔ وہ محض اپنی صلاحیتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اور سماجی حیثیت کے ڈنک کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ آج معاشرے میں نام کے بعد ڈگریوں کی بنیاد پر کسی کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کا رواج ہے۔ لیکن اگر ہم انسانی وجود کی ہمہ جہت نشوونما کی بات کرتے ہیں تو ہمیں ذرا مختلف زاویے سے سوچنا ہوگا۔ صاحب صلاحیت فرد، چاہے وہ ڈگری لے کر اسے اپنے نام کے ساتھ لکھنا پسند کرے یا سرے سے ڈگری لینا ہی پسند نہ کرے، اپنی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ ڈگری کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ڈگریوں کے ذریعے صلاحیت کا اظہار اس کے خود مرکوز اعتماد کو فروغ نہیں دیتا۔ یہ رویہ تقابلی ہے اور اسی لیے سماج مخالف بھی ہے۔ تقابل کا استعمال صرف افادی مقصدیت کے لئے ہوتا ہے۔ معلم کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ صلاحیتوں میں فرق کرے اور ان کے تجزیے میں کم و بیش کو روا رکھے۔

چونکہ ہم فرد کی ہمہ جہت نشوونما کی بات کرتے ہیں اس لئے ابتدا میں طالب علم کو اس کی اجازت دینے سے احتراز کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے موضوعات کا انتخاب خود کرے۔ اس لئے کہ اس کا امکان رہے گا کہ اس کا انتخاب من کی لمحاتی ترنگ، پہلے سے طے شدہ مقاصد یا سہل پسندی کے تحت ہو۔ لیکن اگر ہم اس کی

خود شناسی کو بیدار کر کے اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا اختیار دیں تو وہ انتخاب میں آسان موضوعات لے کر کامیابی حاصل کرنے کو مدنظر نہ رکھ کر ایسے موضوعات کا انتخاب کرے گا جو اس کی صلاحیتوں کو اس کی بلند ترین حد تک ظاہر کر سکے۔ اگر طالب علم کو شروع ہی سے زندگی کو مجموعی طور پر دیکھنے کے قابل بنایا جائے تو وہ نفسیاتی، عقلی اور جذباتی مسائل سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوگا۔

زندگی کے مختلف النوع مسائل سے مناسب طور پر عہدہ بر آ ہونا ہی دراصل ذکاوت ہے۔ طالب علموں کی درجہ بندی اور نمبروں کے حاصل کر لینے سے اس کی ذکاوت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ انسانی وقار کو مجروح کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس تقابل سے ذہن اپاہج ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معلم ہر طالب علم کے ارتقا پر نظر نہ رکھے یا اس کے ارتقا کی رفتار پر غور و فکر نہ کرے۔ والدین کو فطری طور پر اپنے بچوں کی نشو و نما سے کما حقہ واقف رہنے کا تجسس ہوتا ہے اور معلم کو انہیں طالب علم کے ارتقا کی رفتار سے متعلق معلومات فراہم کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ اگر معلموں کی کاوشوں کی سمت کا علم والدین کو نہیں ہو سکا تو وہ اس معلومات کو بنیاد بنا کر طالب علم پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق نتائج لائیں۔ اور اس طرح معلم کی ساری محنت ضائع ہو سکتی ہے۔

والدین کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس اسکول میں ان کے

بچے کا داخلہ ہوا ہے وہاں کس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عموماً وہ اپنے بچوں کو ایسی اسناد حاصل کرتے دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں جو ان کے ذریعہ معاش کو یقینی بنا سکیں۔۔ بہت کم والدین ہوتے ہیں جو اس سے زیادہ کی امید رکھتے ہیں۔ یقیناً ان کی خواہش اپنے بچوں کو مسرور و شاداں دیکھنے کی ہوتی ہے لیکن بہت کم والدین ہوتے ہیں جو اس معمولی خواہش کے برعکس بچوں کی ہمہ جہت نشو و نما کے لئے فکر مند ہوں۔ چونکہ بیشتر والدین بچوں کے مستقبل کو ذریعہ معاش کے حصول کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اس لئے وہ بچوں کو دھمکی اور دباؤ کے ذریعے کتابی علم حاصل کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس طرح کتاب کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ اس کے توسط سے محض یادداشتوں کا تحفظ ہی ہوپاتا ہے اور طالب علم بغیر غور و فکر کے سبق کو بار بار دہرا کر ذہن میں محفوظ رکھنے کو کافی سمجھ لیتا ہے۔

معلم کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ والدین تعلیم کے عمق اور وسعت سے بے توجہی برتتے ہیں۔ بیشتر والدین کی تمنا صرف یہی ہوتی ہے کہ ان کا بچہ یہ سطحی علم حاصل کر کے گمراہ معاشرے میں ایک معزز عہدے پر فائز ہو جائے۔ اس لئے معلم کی ذمہ داریوں میں یہ ذمہ داری بھی شامل ہو جاتی ہے کہ وہ ایک طرف بچے کو صحیح زاویے سے تعلیم دے اور دوسری طرف یہ بھی دیکھتا رہے کہ کہیں والدین اسکول میں کی گئی اس کی محنت کو ضائع تو نہیں کر رہے ہیں۔

اسکول اور گھر کی حیثیت صحیح تعلیم کے مشترکہ مرکز کی ہونی چاہئے۔ نہ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متضاد و متخالف رویہ روا رکھیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ طالب علم سے والدین کی توقعات تو کچھ ہوں اور معلم یکسر مختلف زاویے سے محنت کر رہا ہو۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ والدین معلم کی سرگرمیوں سے بخوبی واقف ہوں اور بچے کی ہمہ جہت نشوونما سے انہیں پوری دلچسپی ہو۔ اس سلسلے میں والدین کی ذمہ داری معلم سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ انہیں سارا بوجھ معلم پر ہی نہیں چھوڑ دینا چاہئے جو پہلے سے ہی زیر بار ہے۔ ہمہ جہت نشوونما کا تصور اسی وقت متشکل ہو سکے گا جب معلم، متعلم اور والدین کے درمیان صحیح اشتراک عمل قائم ہو گا۔ معلم والدین کے تصورات اور مفروضات کو کسی بھی صورت قبول نہیں کر سکتا اسی لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ معلم کی کارکردگی کی مکمل معلومات والدین کو رہے اور دونوں اپنے اپنے متضاد رویے کے ذریعے بچے میں شکوک و شبہات اور انتشار کی تخم ریزی نہ کریں۔

بنیادی طور پر بچوں میں کچھ سیکھنے کی خواہش اور معلومات حاصل کرنے کا تجسس ہوتا ہے۔ جسے کمال ہوش مندی کے ساتھ مسلسل حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ آگے چل کر مسخ ہوئے بغیر یہ خواہش ان میں مستحکم رہے اور مختلف مضامین کے مطالعے کی طرف بتدریج ان کی رہنمائی ہو سکے۔ اگر سیکھنے اور سمجھنے کے اس شدید جذبے کی مناسب حوصلہ افزائی مسلسل ہوتی رہے

تو ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، سائنس یا کوئی اور مضمون مطالعے کے دوران مسئلہ نہیں بنے گا۔ نہ بچے کے لئے اور نہ معلم کے لئے۔ جب ہوشمندی کے ساتھ تربیت اور محبت و شفقت کا خوش گوار ماحول بن جاتا ہے تو حصول علم بہت آسان ہو جاتا ہے۔

جذباتی کشادگی اور حسیّت کی تخم ریزی اسی صورت میں ممکن ہے جب طالب علم معلم سے اپنے رشتے کو محفوظ تصور کرے۔ تحفظ کا احساس بچوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ تحفظ اور انحصار میں بڑا فرق ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر معلم طالب علم میں انحصار کی عادت ڈال دیتے ہیں جس سے بالواسطہ طور پر ان میں در آئے خوف کو تقویت پہنچتی ہے۔ والدین بھی اپنے مشفقانہ یا جارحانہ رویے سے اکثر یہی کرتے ہیں۔ جب بچے میں انحصار کا جذبہ پروان چڑھتا ہے تو وہ وہی کرتا ہے جو اس کے والدین یا معلم کی مرضی ہو۔ انحصار اور خوف لازم و ملزوم ہیں اور خوف بچے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کا فرماں بردار رہتے ہوئے ان کی پیروی کرے۔ انحصار کے اس ماحول میں حسیّت کہاں محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس جب بچہ اپنے کو محفوظ تصور کرتا ہے تو اس کی حسی اور جذباتی نشوونما میں خوف کبھی مزاحم نہیں ہو پاتا۔

بچوں میں تحفظ کا یہ احساس عدم تحفظ کی ضد کے معنی میں نہیں ہے۔ تحفظ سے مراد یہ ہے کہ بچہ بے تکلفی کا احساس کر سکے۔ اسے محسوس ہو کہ وہ

جیسا بھی ہے آزادی سے اسی طرح رہ سکتا ہے۔ اسکول ہو یا گھر، اسے کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ اسے یہ ڈر نہ ہو کہ کسی کام کو کرنے پر اسے مجبور کیا جائے گا۔ اسے ایسا ماحول ملے جہاں وہ جب چاہے اس یقین کے ساتھ درخت پر چڑھ سکے کہ گرنے پر اسے جھڑکیاں نہیں ملیں گی۔ تحفظ کا یہ احساس اسی وقت بیدار ہو سکتا ہے جب والدین اور معلم بچے کی فلاح و بہبود کے بارے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کریں۔

یہ بہت اہم ہے کہ بچے کو پہلے ہی دن سے تحفظ کا احساس ملے۔ پہلے دن کا یہ احساس بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن اگر معلم مصنوعی انداز میں محض بچے کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اس سے کہتا ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے تو اس میں انحصار کی تخم ریزی ہو جاتی ہے اس مصنوعی رویے سے بچے میں تحفظ کا احساس بیدار نہیں ہوتا۔ اسے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ جہاں وہ آیا ہے وہاں لوگ واقعی اس کی فلاح بہبود کے لئے فکر مند ہیں۔

اس نئے تعلق کے استوار ہونے کی بنیاد اعتماد ہے جو بچے میں اس سے پہلے موجود نہیں ہوتا۔ یہ اعتماد فطری غور و فکر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور بچہ بڑوں کا احترام محض اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ جو بچہ اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتا ہے اس میں بڑوں کے لئے احترام اپنے ہی فطری انداز میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس میں عادت اور رویے بڑوں کے ذریعے لادے ہوئے نہیں

ہوتے بلکہ حصول علم کے ایک ضروری حصے کے طور پر ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ چونکہ وہ معلم سے اپنے رشتے کو محفوظ سمجھتا ہے اس لئے ذمہ داری کا احساس اس کے اندر فطری طور پر پنپتا ہے۔ جب بچے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب جو جی چاہے کر سکتا ہے تو وہ فطری طور پر یہ بھی سمجھ جاتا ہے کہ اس کے لئے کیا کرنا ٹھیک رہے گا۔ اس کا یہ عمل نہ رد عمل کے طور پر ابھرا ہوا ہوتا ہے، نہ کسی ضد کے نتیجے میں اور نہ کسی لمحاتی ترنگ کے تحت۔

حسیت کا مفہوم اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں کے لئے حساس ہونا ہے۔ خواہ وہ پودے ہوں، خواہ حیوان یا درخت۔ خواہ آسمان ہو یا پانی ہو یا مصروف پرواز پرندہ، اپنے آس پاس بکھرے لوگوں کے مختلف مزاج ہوں یا راہ چلتا کوئی اجنبی مسافر، حسیت کو اپنا کام کرنا چاہئے۔ حسیت کی یہ قسم اس جذبے کو پروان چڑھاتی ہے جو نجی مفادات سے عاری اور جمع و خرچ سے ماورا ہوتا ہے۔ یہی سچی اخلاقیات ہے اور یہی خوش خلقی۔ اس خصوصیت کے پیدا ہونے پر بچے کا سلوک پوشیدہ اور خفیہ نہیں، آزاد ہو گا اور وہ معلم کا مشورہ مزاحمت کے بغیر بہ آسانی قبول کرے گا۔

چونکہ ہم انسانی وجود کی ہمہ جہت نشو و نما کے خواہاں ہیں اس لئے ہمیں انسان کی جذباتی ضروریات کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ ضرورتیں منطقی استدلال سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہیں۔ ہمیں اس جذباتی صلاحیت کو فروغ دینا چاہیے۔ اس کے

لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں سمجھیں اور جذباتی اور عقلی معاملات سے نبرد آزمائی کی اہلیت پیدا کریں پھر بغیر کسی خوف کے اس صلاحیت کو کار آمد بنایا جا سکتا ہے۔

انسانی وجود کی ہمہ جہت نشو و نما میں حسیت کی بیداری کے لئے تنہائی اور غور و فکر ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تنہائی کسے کہتے ہیں؟ غور و فکر سے کیا مراد ہے؟ موت کا کیا مطلب ہے؟ یہاں محض تنہائی، غور و فکر اور موت کے معنی معلوم کرنا کافی نہیں ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ پڑھانے سے حل نہ ہوگا۔ اسے بس سیکھا جا سکتا ہے صرف ان الفاظ کے معنی سمجھ لینے سے ان کی افادیت ثابت نہ ہوگی، بلکہ تنہائی اور غور و فکر کے تجربے اور سیکھنے کا تجسس ہی اس میں معاونت کر سکتا ہے۔ تجسس حصول علم میں معاون ہوتا ہے لیکن یہی تجسس جب ماقبل معلومات کی رہنمائی قبول کر لیتا ہے یا کسی دوسرے کے تجربے سے متاثر ہوتا ہے تو حصول علم محض نقالی بن جاتا ہے اور نقالی سے ایسا ہی انسان وجود میں آسکتا ہے جو آزمودہ تجربات کو بغیر کسی تجربے کے دہراتا رہتا ہے۔

تعلم محض اطلاعات کی فراہمی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک متجسس ذہن کی بیداری کا نام ہے۔ ایسا ذہن سوالات کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مذہب کیا ہے اور مذہب کے بارے میں محض مسلمہ مفاہیم کو قبول نہیں کر لیتا کہ یہ عبادت گاہ ہے اور یہ طریقہ عبادت۔ خدا کی تلاش یا حق کی تلاش یا اسے جو بھی نام دیں، ہی اصل مذہب ہے۔ نہ کہ محض عقائد و روایات کی پیروی کو مذہب مان

لیا جائے۔

بالکل ایسے ہی جیسے کوئی طالب علم روزانہ دانت صاف کرتا ہے، روزانہ غسل کرتا ہے، روزانہ نئی چیزیں سیکھتا ہے، اسے روزانہ کسی کے ساتھ یا تنہائی میں خاموش بیٹھنے کا عمل بھی کرنا چاہئے۔ تنہائی پسندی ہدایات سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ نہ کسی بیرونی یا روایتی دباؤ سے اور نہ اس عادت سے کہ فکر و تردد سے نجات حاصل کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر اسے اپنایا جائے۔ یہ سب مذکورہ تنہائی کی عادت ڈالنے میں معاونت نہیں کرتے۔ تنہائی تو اپنے اندر جھانکنے کا نام ہے، جہاں اپنا وجود آئینے کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور ہوس کی بے سود کوششوں اور زندگی کی پیچیدگیوں سے آزاد کرتی ہے۔ ذہنی انتشار اور خوف سے نجات کا ذریعہ بھی اپنے آپ میں ڈوب جانے کا یہی عمل بنتا ہے۔ یہ عمل دماغ کو استحکام اور استقامت دیتا ہے، جسے وقت کے کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ ذہن و دماغ کا یہ عمق ہی کردار کہلاتا ہے اور کردار کا نہ ہونا ہی تناقض بالذات اور داخلی انتشار کی کیفیت ہے۔

حساس ہونے کا مطلب ہی محبت کرنا ہے۔ لفظ محبت اصل محبت نہیں ہے۔ محبت کو تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خدا کی محبت ہے اور یہ انسان کی۔ محبت کی پیمائش ممکن نہیں ہے کہ یہ کسی ایک کی محبت ہے یا ہجوم کی۔ محبت تو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے کا نام ہے۔ جیسے ایک پھول اپنی خوشبو بکھیرتا ہے۔ لیکن ہم عموماً رشتوں کے توسط سے محبت کی پیمائش کرتے ہیں اور اس

جذبے کو ضائع کر دیتے ہیں۔

محبت مصلحین اور سماجی کارکنوں کے ذریعہ لی یا دی جانے جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کوئی سیاسی آلہ نہیں ہے جس کے ذریعے عمل پر اکسایا جاسکے۔ جب مصلحین یا سیاست داں محبت کے لفظ کا استعمال کرتے ہیں تو وہ اس کی حقیقت کا لمس بھی نہیں کر پاتے۔ اس لئے کہ محبت کو فوری یا مستقبل بعید میں کسی نتیجے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ محبت کا دائرہ کرۂ ارض پر بسیط ہے نہ کہ کسی مخصوص جنگل یا میدان تک محدود۔ محبت کی حقیقت کا احاطہ کسی مذہب کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا اور جب منضبط مذاہب محبت کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا وجود ہی ختم ہونے لگتا ہے۔ سماج، منضبط مذاہب اور مقتدرہ حکومتیں اپنی مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہ کر لاشعوری طور پر محبت کی روح کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے لئے محبت عمل کے لئے محرک محض ہو جاتی ہے۔

بنی نوع انسان کی ہمہ جہت نشوونما کے دوران صحیح تعلیم کے ذریعے محبت کی اصل روح کی پرورش پر ابتدا ہی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ محبت جذباتی لگاؤ یا پرجوش عقیدت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو موت کی طرح ہی ایک اٹل اور مستحکم جذبہ ہے۔ علم کے ذریعے محبت کو خریدا نہیں جاسکتا۔ اور وہ دماغ جو محبت سے عاری رہ کر علم کے تعاقب میں ہے وہ بے رحمانہ سلوک ہی روا رکھتا ہے اور محض بہتر کارگزاری ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اس لئے معلم کے لئے ضروری

ہے کہ وہ بچے میں ابتدا ہی سے محبت کی اصل روح کو بیدار کرے جو انکساری، خوش خلقی، التفات، صبر و تحمل اور انسانیت کی مظہر ہو۔ شرم اور خوش خلقی ایک داخلی وصف ہے جو صحیح تعلیم سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص سب کے لئے یکساں طور پر رحم دل ہوتا ہے۔ چاہے وہ جانور ہوں یا درخت۔ اور یہ وصف اس کے برتاؤ، رہن سہن اور انداز گفتگو سے مسلسل ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

محبت کا یہ معیار انسانی ذہن کو حرص و ہوس رانی، تقلید اور بے جا تحصیل سے آزاد کر دیتا ہے۔ کیا یہ محبت کی اپنی تہذیب نہیں ہے جو اپنے آس پاس احترام اور خوش کرداری کا ماحول تعمیر کرتی ہے؟ کیا ذہن کی آلودگی کو دور کرنے میں محبت کی معاونت شامل نہیں ہے؟ برتاؤ میں خوشگوار تبدیلی کسی خارجی ذریعے سے نہیں آتی ہے۔ یہ محبت کی حقیقت کے ادراک کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب محبت کو سمجھنے کا شعور بیدار ہو جاتا ہے تو جنسی عمل اور اس کی تمام پیچیدگیوں اور انسانی رشتوں کی لطافتوں کو ہوشمندی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے، جوش جذبات اور خوف کے زیر اثر نہیں۔

اس معلم کو جس کی نظر میں انسانی وجود کی ہمہ جہت نشوونما بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جنسی خواہشات کی ان پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہیے جو ہماری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ ابتدا ہی سے بچے کے فطری تجسس کی تسکین کرے تاکہ اس تعلق سے اس کے اندر مریضانہ دلچسپی پیدا

نہ ہو۔ اگر یہ کام محبت اور ہمدردی کے مناسب رویے کے ساتھ نہ کیا گیا تو عنفوان شباب میں جسمانی معلومات کی فراہمی شہوت رانی کے تجربوں کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ محبت دماغ میں ابھرنے والی خرافات کو صاف کرتی ہے۔ اگر معلم محبت اور بچے کی نفسیات کو سمجھے بغیر محض لڑکے اور لڑکیوں کو سخت ہدایات کا پابند یا کانٹے دار تاروں سے الگ الگ کر دیتا ہے تو اس سے تجسس اور ہیجان میں اضافہ ہوتا ہے جسے بچہ کسی بھی طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ لیکن صحیح طور پر تعلیم دی جائے۔

محبت کا یہ مخصوص معیار کسی بھی کام کی انجام دہی کے دوران خواہ وہ کام باغبانی کا ہو، بڑھئی کا ہو، مصوری کا ہو خواہ دست کاری کا خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ محبت کا یہی مخصوص معیار احساس کی سطح پر درختوں، پہاڑوں، حسن ارضی اور انسان ساز غریبی کو دیکھتے وقت اور موسیقی، پرندوں کی چہچہاہٹ اور رواں پانی کی گنگناہٹ سنتے وقت بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ہماری توجہ دماغ کی تربیت اور جذباتی حسیت کو بیدار کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ جسمانی صحت کی طرف بھی ہمیں توجہ دینی ہوگی۔ کیونکہ اگر جسم صحت مند نہیں ہے تو اس سے خیالات متاثر ہوں گے اور بے حسی کو تقویت پہنچے گی۔ یہ بات واضح ہے اس لئے ہم اس کی تفصیلات پر نہیں جاتے۔ یہ ضروری ہے

کہ صحیح غذا لی جائے اور پوری نیند آئے تا کہ جسمانی صحت اعلیٰ رہے۔ اگر احساس مستعد نہیں ہے تو جسم انسان کی ہمہ جہت نشو ونما میں رکاوٹیں کھڑی کرے گا۔ جسمانی صحت کو اچھی حالت میں رکھنے کے لئے ورزش کی مختلف شکلیں، رقص، یوگا سن اور کھیل وغیرہ ہیں، جن کی اپنی اہمیت ہے۔ وہ جسم جسے صاف ستھرا نہیں رکھا گیا ہے، جو بے ڈھنگا ہے وہ جذبات اور احساسات کو درست حالت میں رکھنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔ جسم دماغ کا آلہ نہیں لیکن جسم، جذبہ اور دماغ مل کر ایک مکمل انسانی وجود کی تخلیق و تکمیل ضرور کرتے ہیں۔ جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہوگی، باہمی تصادم ناگزیر ہوگا۔

تصادم بے حسی کا خالق ہے۔ دماغ جسم پر قابو پا کر یا اس پر اقتدار قائم کر کے احساس کو کچل دیتا ہے جس سے جسم بے حس بن سکتا ہے۔ اور ایک بے حس جسم ذہنی آزادہ روی اور بلند پروازی میں مزاحم ہوتا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جسم کی اذیت کوشی شعور کی گہری پرتوں کو ہٹا کر اس کی اندرونی تہ تک پہنچنے میں بالکل معاونت نہیں کرتی۔ یہ عمل اسی وقت ممکن ہے جب دماغ، جذبات اور جسم متصادم نہ ہوں، ان میں اتحاد اور ہم آہنگی ہو اور یہ آگے بڑھنے کے لئے کسی بندھے ٹکے تصور، تمثیل یا عقیدے کی ہدایات کے پابند نہ ہوں۔

ذہنی بیداری کے عمل میں ہمارا زور "انہماک" پر نہیں "توجہ" پر ہونا چاہیے۔ انہماک نام ہے ذہن کو کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنے کا۔ جب کہ توجہ

لامحدود ہے۔ انہماک کا عمل ذہن کو محدود دیواروں اور سرحدوں میں قید کردیتا ہے اور ذہن کی نشوونما میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ توجہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس میں معلومات کی حدبندیاں بھی نہیں ہیں۔ انہماک سے حاصل ہونے والا علم اپنی حدیں خود بھی رکھتا ہے۔ توجہ کو ہم جن معنوں میں استعمال کرتے ہیں وہ اس معلومات کا مناسب استعمال کرتی ہے۔ انہماک ایک جز ہے اور تکمیل کا ادراک جز کی قوت اختیار سے باہر ہے۔ معلومات جو انہماک کے عمل کا ایک ضمنی حصہ ہے، ایسی سمجھ پیدا کرنے میں قاصر ہے جو لامحدود ہو۔ انہماک کے دائرے میں رہتے ہوئے تکمیل کا احساس ہونا ناممکن ہے۔

اس طرح توجہ بنیادی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے انہماک کی کوششوں کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ توجہ وہ صورت حال ہے جہاں ذہن لامرکزیت کے احساس کے ساتھ اپنے اطراف بکھرے اجتماعی تجربات اور معلومات سے کچھ سیکھتا ہے۔ انہماک میں بتلا ذہن حاصل شدہ معلومات کو اپنی توسیع کے طور پر استعمال کرتا ہے اور یہ عمل اپنی تردید آپ اور سماج مخالف بن جاتا ہے۔

سیکھنے کا عمل اپنے صحیح مفہوم میں صرف توجہ ہی سے ممکن ہو پاتا ہے جس میں کوئی خارجی یا داخلی جبر نہیں ہوتا۔ صحیح فکر اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ذہن روایات اور یادداشتوں کا غلام نہ ہو۔ توجہ ہی ذہن کو سکون فراہم کرتی ہے

جس سے تخلیق کے دروازے کھلتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ توجہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ذہنی نشوونما کے عمل میں معلومات کی اہمیت صرف وسیلہ کی ہے، مقصود یا منزل کی نہیں۔ چونکہ ہمارا تعلق محض کسی ایک صلاحیت مثلاً ریاضی، سائنس یا موسیقی کی صلاحیت کی نشوونما سے نہیں ہے بلکہ طالب علم کو ایک انسانی وجود کی حیثیت سے ہمہ جہت نشوونما کی طرف لے جانا ہے۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توجہ کی یہ کیفیت پیدا کیسے ہوگی؟ یہ کیفیت ترغیب و تحریص، تقابل و موازنہ، انعام و سزا یا کسی اور طرح کے جبر سے بیدار نہیں ہو سکتی۔ ذہن سے خوف کا اخراج توجہ کی ابتدا کا پہلا قدم ہے اور خوف اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک کچھ حاصل کرنے اور کچھ بننے کی خواہش موجود رہتی ہے۔ کامیابی کا تعاقب اپنے تمام تر پر فریب تضادات اور انتشار کے ساتھ مزاحم ہوتا ہے۔ انہماک کی تعلیم ممکن ہے لیکن توجہ کے لئے تعلیم کا امکان خارج از بحث ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے خوف سے عاری ہونے کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ہم خوف پیدا کرنے والے اسباب کی تلاش شروع کر سکتے ہیں اور انہیں سمجھنے کے بعد خوف ختم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح توجہ اس وقت خود بخود پیدا ہوتی ہے جب طالب علم کے چاروں طرف فطری ماحول ہو، تحفظ اور اپنے پن کا احساس ہو، بے فکری ہو اور شفقت و محبت کا وہ ماحول ہو جو غیر جانبدار اور

بے لوث ہو کر کسی کام کے لئے اکسا سکے۔ محبت تقابل سے عاری ہے اور اسی وجہ سے کچھ بن جانے کی اذیت ناک خواہش کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

عدم اطمینان، جس کا تجربہ خواہ جوان ہو یا بوڑھا، سبھی کو ہے، جلد ہی اطمینان کا کوئی راستہ تلاش کر لیتا ہے اور اس طرح ہمارے ذہن کو سلا دیا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً غموں کی یورش اسے نیند سے بیدار کرتی رہتی ہے لیکن ذہن ہر بار کوئی نہ کوئی اطمینان بخش حل نکال لیتا ہے۔ اس طرح ذہن اطمینان اور عدم اطمینان کے دائرے میں مقید ہو جاتا ہے اور غموں کی وجہ سے جو بیداری آتی ہے وہ ہمارے عدم اطمینان کا محض ایک حصہ ہوتی ہے۔ عدم اطمینان استفسار کا راستہ استوار کرتا ہے لیکن وہاں استفسار کا وجود ہی نہیں ہوتا جہاں ذہن روایت اور مثالیت سے بندھا ہوا اور استفسار ہی دراصل توجہ کی شعلگی کا مخرج ہے۔

عدم اطمینان سے میری مراد اس کیفیت سے ہے جس میں ذہن کسی چیز کو اس کی حقیقی حالت میں دیکھتا ہے اور مسلسل استفسار سے آئندہ بھی تلاش جاری رکھتا ہے۔ عدم اطمینان ایسی تحریک کا نام ہے جو اصل حدوں سے آگے لے جاتی ہے۔ اگر آپ عدم اطمینان کی اس کیفیت کو دباتے ہیں یا اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ خود مرکوز اعمال کی حدود کو اور اس معاشرے کو جس میں اپنے آپ کو پاتے ہیں، بجنسہٖ قبول کر لیں گے۔

عدم اطمینان کا شعلہ اطمینان کے فاضل مادے اور گندگی کو جلا کر راکھ

کر دیتا ہے۔ عدم اطمینان سے ہماری مراد اس کیفیت سے نہیں ہے جس کے تحت انسان ایک بڑے مکان، ایک اچھی کار یا ان جیسی کچھ اور چیزوں کے تعاقب میں رہتا ہے۔ میں جس عدم اطمینان کی بات کر رہا ہوں اس میں نہ حسد کی گنجائش ہے نہ کچھ اور پانے کی خواہش اور نہ اسے ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے حصول سے دبایا جا سکتا ہے۔ یہ عدم اطمینان تو ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہے اور یہ ہر شخص میں موجود ہوتا ہے بشرطیکہ غلط تعلیم کے ذریعے، حسد کے زیر اثر یا کسی مثالیت کی تقلید سے لمحاتی اطمینان حاصل کر کے اسے ختم نہ کر دیا گیا ہو۔ جب ہم عدم اطمینان کی اصل حقیقت سے واقف ہو جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ توجہ اس شعلہ جوالا کا محض ایک جزو ہے جو حقیر چیزوں کو جلا دیتا ہے اور اس کے بعد ذہن کو تمام آلائشوں، قیود اور حد بندیوں سے آزاد کر کے خود غرضی اور اطمینان سے دور لے جاتا ہے۔

اس طرح توجہ وہیں پنپتی ہے جہاں خود غرضانہ پیش قدمی کا جذبہ اور اطمینان کی طلب کا فقدان ہوتا ہے۔ اس لیے توجہ کی تخم ریزی بچوں میں ابتدا ہی سے کی جانی چاہئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں محبت انکسار، خوش خلقی، تحمل اور شرافت کے ذریعے خود کو ظاہر کرتی ہے وہاں ان تمام حد بندیوں کی شکست وریخت شروع ہو جاتی ہے جنھیں بے حسی نے تعمیر کیا ہوتا ہے اور اس طرح بچپن میں ہی توجہ کی کیفیت پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

توجہ سیکھنے سے نہیں آتی۔ اسے طالب علم میں اس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اس کے چاروں طرف جبر کا احساس ختم کر دیا جائے جو اپنی ہی تردید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر اس کی توجہ کو کسی بھی موضوع پر کبھی بھی مرکوز کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ انہماک کی تنگنائے میں الجھ کر کامیابی حاصل کرنے کے جبر میں گرفتار نہیں ہوگا۔

اس طرح سے تعلیم یافتہ نسل ہر طرح کی ہوس رانی اور خوف کے جذبے سے آزاد ہوگی۔ ان پر والدین کی نفسیاتی دراثت یا اس معاشرے کی جس میں وہ پیدا ہوا ہے یا والدین کی جائداد کے حصول کا اثر نہیں پڑے گا۔ جانشینی کا یہ عنصر بھی آزادی کو سلب کر دیتا ہے۔ اس سے ذہانت بھی متاثر ہوتی ہے کیونکہ اس سے تحفظ کا ایک بے معنی احساس اور بے بنیاد خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ تحفظ کا یہ مہمل تصور ایسی ذہنی تاریکی کی طرف لے جاتا ہے جس میں قوت نمو ہوتی ہی نہیں ہے۔ لیکن جو نسل اس یکسر مختلف نوعیت سے تعلیم یافتہ ہوئی ہے اس سے ہم ایک نئے معاشرے کی تعمیر کی امید رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پاس ذہانت اور صلاحیت ہوگی۔ ایسی ذہانت اور صلاحیت جس پر خوف کا سایہ بھی نہ پڑا ہو۔

چونکہ تعلیم والدین اور معلم کی مشترکہ ذمہ داری ہے اس لئے ہمیں باہمی اشتراک کا فن سیکھنا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم میں سے ہر ایک معلوم کرے کہ سچ کیا ہے۔ یہ سچ کا ادراک ہی ہے جو ہمیں قریب لاتا ہے،

خیالات و نظریات یہ کام نہیں کر سکتے۔ تصور اور حقیقت کے درمیان ایک طویل فاصلہ ہے۔ تصور ہمیں عارضی طور پر قریب لا سکتا ہے لیکن کام کا یہ اشتراک احساس جرم کی طرح ہے تو جلد ہی علاحدگی کی شروعات ہو جاتی ہے۔ اگر ہم دونوں میں دونوں نے سچ کا دیدار کیا ہے تو ممکن ہے کچھ باتوں سے متعلق اختلافات پھر بھی پیدا ہوں۔ لیکن اس سے علاحدگی کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوگی۔ معمولی معمولی باتوں پر منتشر ہو جانے والے لوگ احمق ہوتے ہیں۔ جب حقیقت کے دیدار ہو جاتے ہیں تو اختلافی باتیں کبھی مسئلہ نہیں بنتیں۔

ہم میں سے بیشتر لوگ باہمی اشتراک کے معینہ خطوط پر کام کرنے کے عادی ہیں۔ کسی خیال یا مثال کے مطابق کام کرنے کے لئے ہم لوگ ساتھ آسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق حقائق سے نہیں ہوتا اس لئے انہیں بار بار سمجھانے اور تشہیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ کسی تصور یا مثال کی پیروی کے لئے اشتراک عمل حقیقت کے دیدار سے حاصل تعاون سے یکسر مختلف ہے۔ جس میں دوران عمل بھی سچ کی لازمیت رہتی ہے۔ اقتدار کی پیروی میں جوش و خروش سے کام کرتے رہنا قطعی معاون نہیں ہے۔ چاہے یہ اقتدار مثالیت کا ہو یا کسی ایسے فرد کا حق ہو جو مثالیت کی نمائندگی کرتا ہو۔ اقتدار کی مرکزیت سے متصف فرد جو وسیع معلومات اور موثر شخصیت کا مالک ہے اور جس کے اوپر مختلف خیالات کا تسلط ہے، دباؤ میں یا محسوس نہ کئے جاسکنے والے اصرار کے تحت کچھ لوگوں کو اپنے

لئے کام کرنے پر اکسا سکتا ہے لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ تعاون کی کوئی مستحکم شکل نہیں ہے۔ جب کسی بات کی سچائی کو ہم میں سے ہر فرد سمجھ لیتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایسی مشترکہ فہم کا وجود سامنے آتا ہے جو عمل کے لئے متحرک کرتی ہے یہی مشترکہ عمل ہی دراصل تعاون ہے۔ اس لئے کہ جو حق کو حق کی حیثیت سے دیکھ لیتا ہے وہ ناحق کو ناحق کی حیثیت سے بھی سمجھ لیتا ہے۔ اور ناحق میں پوشیدہ حق بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہی ضرورت پڑنے پر تعاون دینے یا نہ دینے کی صلاحیت کا اہل ہوگا اور یہ اہلیت مساوی اہمیت رکھتی ہے۔

اگر ہم میں سے ہر ایک پر اس بات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم میں ایک بنیادی انقلاب کی ضرورت ہے اور وہ اس حقیقت کے دیدار کر لیتا ہے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے تو ہم اتفاق یا عدم اتفاق کے بغیر یا تعاون کی درخواست کئے بغیر بھی ساتھ ساتھ کام کر سکیں گے۔ اتفاق اور عدم اتفاق کا وجود اسی وقت برقرار رہ پاتا ہے جب کوئی اپنا ایک مستحکم کردار متعین کر لیتا ہے اور اس سے آگے پیچھے ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔ یا جب وہ کسی خیال سے متفق ہو جاتا ہے یا کسی رائے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے تو اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو دو میں سے کسی ایک کو اس خیال یا رائے کو ماننے کے لئے راضی کرنا پڑتا ہے یا متاثر کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم میں سے ہر ایک کو سچائی کا

دیدار ہو جاتا ہے تو ایسی صورت حال آتی ہی نہیں۔ اس صورت میں یہ اعتماد محض لفظی استحکام پر مبنی اعتماد نہیں ہوگا اور نہ منطقی استدلال سے کیا گیا عمل ہوگا بلکہ حقیقت کا ادراک ہوگا۔ اور حقیقت کے اس ادراک کے بغیر کام شروع کرنے پر اختلاف ہوگا، جھگڑا ہوگا اور اپنی تمام بے معنویت کے ساتھ اتفاق اور عدم اتفاق ہوگا۔

یہ ضروری ہے کہ ہم ساتھ مل جل کر کام کریں۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی عمارت کی تعمیر میں اشتراک عمل ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی عمارت کی تعمیر کر رہا ہو اور دوسرا اسے گراتا جا رہا ہو تو عمارت کبھی مکمل نہ ہو سکے گی اس لئے ہمیں بہت واضح طور پر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آنے والی نسل کو کیسی تعلیم دینی ہے، وہ کیسے زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھے اور انہیں حل کرنے کی اہلیت پیدا کر سکے گا۔ ورنہ اسے ایسے منتشر اجزا میں علم حاصل ہوگا جو کل سے کٹے ہوئے ہوں گے۔

تعاون کی اس صورت میں ساتھ ساتھ کام کرنے کے لئے ہم لوگوں کی اکثر نشستیں ہونی چاہیے۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ دوران گفتگو ہم کہیں تفصیلات کی بھول بھلیوں میں ہی نہ کھو جائیں۔ ہم میں سے ان لوگوں پر جو سنجیدگی سے یہ کام کرنا چاہتے ہیں، صرف یہی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنا کام توجہ سے کریں بلکہ یہ کوشش بھی کرنی چاہئے کہ دوسرے اس کی اہمیت کو

سمجھیں۔ تعلم ایک شریفانہ پیشہ ہے۔ اگر واقعی اسے پیشہ کہا جاسکے۔ تعلم ایسا فن ہے جو محض ذہنی صلاحیت نہیں مانگتا بلکہ غیر معمولی اور بے مثال ضبط و تحمل اور محبت کا بھی متقاضی ہے۔ تعلم کا صحیح مفہوم تو یہی ہے کہ ہم اپنی طویل زندگی میں ہر چیز سے اپنے رشتے کو سمجھ سکیں۔ مثلاً دولت سے، جائداد سے، انسان سے یا فطرت سے ہمارے رشتے کی نوعیت کیا ہے؟

حسن اس سمجھ کا ہی ایک حصہ ہے۔ حسن محض یہ نہیں ہے کہ متناسب اعضا، ہیئت، لذت اور برتاؤ کے دائرے میں اسے محدود کر دیا جائے۔ یہ وہ صورت ہے جہاں سادگی اپنی بلندی پر پہنچ کر انا کو ترک کر دیتی ہے اور سادگی وہیں ہوتی ہے جہاں فطری ریاضت موجود ہوتی ہے۔ جو متعین انضباط اور نفس کشی کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ فطری ریاضت ترک انا کی وہ کیفیت ہے جو محض محبت سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ جب محبت کا فقدان ہو جاتا ہے تو ایک ایسا تمدن وجود میں آتا ہے جہاں حسن کے عناصر کی تلاش بغیر کسی داخلی استحکام کے ہوتی ہے۔ اور فطری ریاضت محض خود فراموشی کی نمائش بن جاتی ہے۔ وہاں ترک انا کا سوال ہی نہیں اٹھتا جہاں انا کی قربانی کا جذبہ محض عملی سرگرمی، مثالیت اور عقاید تک محدود ہو۔ ان سرگرمیوں میں ایسا ظاہر ہونے لگتا ہے کہ انا سے نجات حاصل ہو چکی ہے لیکن حقیقت میں انا مختلف لیبلوں کے تحت اب بھی اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ نا معلوم کا استفسار صرف معصوم ذہن ہی کر سکتا ہے۔ لیکن متاثر معصومیت خواہ وہ

ایک سادہ کپڑا یا راہب کا لبادہ زیب تن کئے ہو، ترک انا کی اس روح کو چھو بھی نہیں پاتی جہاں خوش خلقی، شرافت، تحمل اور انکسار جیسے محبت کے مظاہر موجود ہوتے ہیں۔

ہم میں سے بیشتر حسن کو ان چیزوں تک محدود سمجھتے ہیں جو یا تو خلق کی گئی ہو یا بہتر ترتیب کے ساتھ ظہور میں آئی ہو۔ چاہے وہ انسانی حسن ہو یا کسی عبادت گاہ کا حسن ہم اکثر کہتے ہیں وہ درخت یا وہ مکان یا وہ ندی جو اپنی وسعت کے ساتھ موڑے رہی ہے، خوبصورت ہے۔ اس کے مقابلے اور ضد میں ہم بدصورتی کا تعین بھی کر لیتے ہیں۔ کیا حسن کا تقابل ممکن ہے؟ کیا حسن وہی ہے جو ظاہر یا متشکل کیا جا سکے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ تصویر، یہ شعر، یہ چہرہ خوبصورت ہے۔ اس لیے کہ ہم نے خوبصورتی کی اس شکل کو معیار سمجھ رکھا ہے جس کی تعلیم ہمیں دی گئی ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے اپنے طور پر کچھ تصور کر لیا ہے۔ کیا تقابل حسن کی موت نہیں ہے؟ کیا حسن محض معلوم سے شناسائی کا نام ہے؟ یا یہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جسے متشکل کیا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی؟

ہم لوگ ہمیشہ حسن کے تعاقب میں اور بدصورتی سے پیچھا چھڑانے میں لگے رہتے ہیں۔ ایک سے لطف و انبساط کا حصول اور دوسرے سے گریز ہم میں لازمی طور پر بے حسی کی تخم ریزی کرتا ہے۔ حسن کے تجربے اور احساس کے لیے نام نہاد خوبصورتی یا نام نہاد بدصورتی دونوں کے لیے حساس ہونا لازم ہے۔

احساس خوبصورت یا بد صورت نہیں ہوتا۔ یہ صرف احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم انہیں مذہبی نقطہ نظر یا شرائط معاشرہ کے زاویے سے دیکھتے ہیں تو اس پر ایک لیبل چسپاں کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ احساس اچھا ہے اور یہ برا۔ اس طرح ہم اسے مسخ اور برباد کر دیتے ہیں۔ جب تک اس احساس پر کوئی لیبل چسپاں نہیں ہوتا ہے، اس کی حسیت بر قرار رہتی ہے۔ اور یہی اصل اور پر جوش حسیت ہے، جو اس احساس کا ادراک پیدا کرتی ہے جو نہ تو خوب صورت ہے اور نہ بد صورت۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ احساس کو بر قرار رکھا جائے۔ جوش وولولہ محض خود اطمینانی کی لت نہیں ہے بلکہ یہ ایسے حسن کی تخلیق کرتا ہے جو نا قابل موازنہ ہو اور جس کا ثانی نہ ہو۔

انسانی وجود کی ہمہ جہت نشوونما کی تلاش کے دوران ہمیں صریحی طور پر لاشعور پر بھی اتنی ہی توجہ صرف کرنی ہے جتنی شعور پر۔ لاشعور کو سمجھے بغیر شعور کی تربیت انسانی زندگی میں غم، مایوسی اور باہمی تضادات جیسی صفات پیدا کرتی ہے۔ مخفی یا داخلی ذہن خارجی سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے۔ بیشتر معلمین صرف خارجی ذہن کو معلومات فراہم کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں تاکہ طالب علم اپنا ذریعہ معاش پیدا کرے اور معاشرے سے خود کو ہم آہنگ کر سکے۔ اس طرح مخفی ذہن اچھوتا ہی رہ جاتا ہے۔ آج کی نام نہاد تعلیم یہی کر رہی ہے کہ معلومات کی ایک پرت ذہن کی اوپری سطح پر تھوپ دی اور اپنے چاروں طرف

کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ پیدا کر دیا۔ اور بس۔

مخفی ذہن دماغ کی اوپری سطح سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ بھلے ہی اسے تعلیم سے منزین اور اس میں ہم آہنگی کی صلاحیت بیدار کی گئی ہو۔ یہ کوئی بہت پر اسرار شے نہیں ہے۔ مخفی ذہن یا لاشعور نسلی یادداشتوں کا ذخیرہ ہے۔ مذہب، مہمل اعتقادات، علامت، مخصوص قبیلے کی مخصوص روایات اور اس کے ادب کے اثرات، چاہے وہ مقدس ہوں یا نجس، اس ذخیرے میں موجود ہوتے ہیں۔ کسی ایک خاص گروہ کے اجتماعی اثرات کا جس کی اپنی آرزوئیں، انتشار، طرز حیات اور غذا کی اقسام ہیں، اپنے مقاصد کے ساتھ ظاہری اور باطنی خواہشات اور مایوسیاں، اس کی امیدیں اور خوف، پوشیدہ غم اور خوشیاں اور وہ عقاید جو تحفظ کی آرزو کے ساتھ زندہ رہتے ہیں اور وہ مختلف شکلیں بدلتے ہیں۔ ذخیرہ بھی یہی لاشعور ہے، جو نہ صرف ماضی کی باقیات کا غیر معمولی خزانہ ہے بلکہ اس میں مستقبل پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ یہ ذخائر اپنے آپ کو کبھی خواب کے توسط سے ظاہر کرتے ہیں یا جب سطحی ذہن یا شعور روزمرہ واقعات پر پوری طرح قابو نہیں پاتا تو مختلف اطلاعات کے توسط سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ مخفی ذہن یا لاشعور نہ تو کوئی مقدس شے ہے، نہ ہی اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے شعور کا حصہ بنانے کے لئے کسی ماہر کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن لاشعور کی عظیم قوت کے

ساتھ شعور اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ بڑی حد تک شعور اپنے آپ کو لاشعور کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ شعور اپنے ہنگامی اور روزمرہ سماجی مطالبات اور سرگرمیوں کی ضروریات کے سبب لاشعور پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کرتا ہے۔ اس کو متشکل کرنے اور اس پر قابو پانے کی تمام جدوجہد لاشعور کی سطح پر محض ایک خراش ہی ڈال پاتا ہے۔ اس طرح شعور اور لاشعور کے درمیان ایک خلیج حائل ہونے لگتی ہے جس سے باہمی تضاد کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اس خلیج کو پر کرنے کے لئے ہم مختلف تجربات اور نظم وضبط سے کام لیتے ہیں لیکن کامیابی نہیں ملتی۔

شعور فوری اور محدود حال کے ذخائر سے لبریز ہے اور لاشعور پر صدیوں اور قرنوں کی یادداشتوں کا بوجھ ہے، جنھیں فوری ضروریات سے ہلکا نہیں کیا جاسکتا۔ لاشعور میں زمانے کے عمق کی خصوصیت ہے اور شعور جو حالیہ تہذیب وتمدن میں الجھا ہے، اپنی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ لاشعور پر کیسے قابو پاسکتا ہے۔ اس لئے باہمی تضاد کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ شعور کو اس حقیقت کا علم فراہم کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ باطنی خواہشوں کو پھیلنے کا موقع دیا جائے۔ جب ظاہر اور باطن میں ٹکراؤ نہیں ہوگا تو لاشعور اپنے تحمل کے تحت فوری معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔
مخفی ذہن ہی جسے ابھی تک سمجھ پانا ممکن نہیں ہو سکا ہے اور جس کی

چھان بین ابھی نہیں ہوئی ہے، خارجی طور پر تعلیم کی زد میں آتا ہے۔ اس کا سابقہ حال کے فوری مطالبات اور چیلنجوں سے پڑتا ہے۔ یہ ان مطالبات پر مناسب رد عمل بھی ظاہر کرتا ہے لیکن چونکہ مخفی اور خارجی ذہن میں، لاشعور اور شعور میں ٹکراؤ جاری رہتا ہے، اس لئے یہ تعلیم اس ٹکراؤ میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس طرح کے مسلسل تجربے ماضی اور حال کے درمیان خلیج حائل کردیتے ہیں۔ جب شعور اور خارج کا مشترکہ تجربہ بغیر داخل یا لاشعور کو سمجھے ہوئے چلتا رہتا ہے تو باہمی ٹکراؤ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ نہ تو ذہن کو آزادی دیتا ہے اور نہ اس کے اثاثے میں اضافہ کرتا ہے، حالانکہ ہم لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ تجربہ جب تک تجربہ کرنے والے کو تقویت دیتا رہتا ہے ٹکراؤ میں کمی نہیں آتی۔ اس تجربے سے روایت زدہ ذہن اپنی روایت پسندی کو ہی طاقت پہنچاتا ہے، جس سے ٹکراؤ اور مصیبتیں دائمی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ صرف وہ ذہن ہی جو آزادی حاصل کر پاتا ہے، ان باتوں کو اس کی مجموعیت کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب لاشعور کی مخفی تہوں کی قوت اور صلاحیت کا ادراک ہو جاتا ہے تو مسائل کی تفصیلات کو ذکاوت اور ہوشمندی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم لاشعور کی اہمیت کو شعور کی تربیت اور معلومات کے حصول پر ترجیح دیں۔ حالانکہ یہ تربیت اپنی جگہ ضروری ہے۔ لاشعور کی یہ سمجھ ذہن کو

مکمل آزادی کی طرف لے جاتی ہے جہاں باہمی ٹکراؤ نہیں ہوتا اور یہیں سے ذکاوت کی ابتدا ہوتی ہے۔

ہمارا مقصد چونکہ انسان کی ہمہ جہت نشوونما ہے اس لئے ہمیں روزمرہ اہمیت کی بنیاد پر محض شعور کو ہی تقویت نہیں دیتے رہنا ہے۔ ہمیں اس مخفی ذہن یعنی لاشعور پر بھی توجہ دینی ہے۔ کیونکہ اس کا ادراک ہی انسان کو باہمی تضاد اور مصیبتوں سے نجات دلانے کا سبب بن سکتا ہے۔ لاشعور کی یہ ترجیح بھی اپنی ایک حد رکھتی ہے۔ اس پر ایسی توجہ نہ ہو کہ شعور یکسر نظرانداز ہو جائے۔ دونوں پر مساوی توجہ ہی ذہن کو اس کی تکمیلیت کے ساتھ تمام حدوں سے آگے لے جا سکتی ہے جہاں روحانی مسرت کا وہ دائمی احساس موجود ہوتا ہے جو وقت سے ماورا ہوتا ہے۔

کرشنا مورتی کی کتابوں کا ہندی ترجمہ

۱۔ گیات سے مکتی (Freedom from the Known)	۷۰ روپے
۲۔ ہنسا سے پرے (Beyond Violence)	۹۰ روپے
۳۔ سنسکرتی کا پرشن (This Matter of Culture)	۱۰۰ روپے
۴۔ شکشا سنواد (Krishnamurti on Education)	۷۵ روپے
۵۔ اسکولوں کے نام پتر (Letters to the Schools)	۶۰ روپے
۶۔ آمول کرانتی کی آوشیکتا (Urgency of Change)	۶۰ روپے
۷۔ انتم وارتائیں (The Last Talks)	۷۰ روپے
۸۔ سکشا ایوم جیون کا تاتپریہ (Education & the significance of life)	۶۰ روپے

کرشنا مورتی کی کتابوں کا اردو ترجمہ

۱۔ تعلیم اور زندگی کی اہمیت	۵۰ روپے
۲۔ کتاب حیات	۸ روپے

مزید ہندی اردو، بنگالی اور انگریزی تصنیفات کے لئے کرشن مورتی فاؤنڈیشن انڈیا۔ راجگھاٹ فورٹ، وارانسی کو لکھیں۔